ترکی اور ترک اردو نثر میں

محمد نعیم

Abstract:

The cultural relations of Turks and Subcontinent are centuries old. These relations got expression in literature. Early works of Urdu prose presents Turkey as country of fantasy. During the second half of nineteenth century, with the spread of print and colonial regime, Urdu prose incorporated this worldly matters in it. The newspapers and serial fiction presented a selected world to its readers, the world they want to see. Turks and Turkey is part and parcel of this world for the last two centuries. This article explores the aesthetic, moral and political uses of Turks and Turkey in Urdu Prose.

ترکی اور برعظیم کے ثقافتی روابط ہزار برس سے زیادہ کو محیط ہیں۔ اول اول سیاسی تعلقات کا بیج پڑا اور بعد ازاں مذہبی اور تہذیبی تعلقات تناور درخت بن گئے۔ باہمی میل جول نے ترکوں کو ہمارا محبوب بنا دیا اور ہم اس کسک کا اظہار کرنے لگے کہ محبوب ہمارا ترکی ہے ہم ترکی نہیں جانتے۔ یہ سفر بادشاہ اور رعایا، شاعر و سامع اور روزمرہ زندگی کے باہمی ارتباط کی صورت جاری رہا۔ انگریز دور تک آتے آتے برعظیم میں بیسیوں نسلیں گزارنے والے ترک ہمارا اپنا حصہ بن گئے تھے۔

روم ایک جادوئی خطے کی حیثیت سے ہمارے داستانوی ادب کا حصہ رہا ہے۔ جب ہم نے عادل و منصف مزاج بادشاہ کا ملک تصور کرنا ہو، ہم اہلِ اردو کے تخیل پہ ترکی ہی جگمگاتا۔ ہمیں نوشیرواں کی عدالت اور حاتم کی سخاوت کا اجتماع ترکی بادشاہ کے ہاں ملتا تھا۔ جو رعایا کو مرفہ الحال رکھتا تھا اور امن و امان مثالی۔ (1) یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ روم ایک دور دراز مثالی خطے کی حیثیت سے ہماری آرزوؤں کا دیس تھا۔

انیسویں صدی میں اشاعت اور عام تعلیم نے برعظیم کی مختلف زبانوں میں نثر کو فروغ دیا۔ اخبار نے روزمرہ دیسی زندگی اور غیر معمولی بدیسی واقعات سے دلچسپی پیدا کی۔ یوں اردو نثر میں بھی جہانِ دیگر کے بجائے اس جہاں کو وضاحت سے بیان کرنے کا چلن ہوا۔ جنگِ آزادی کے بعد خصوصاً اردو نثر تعلیمی، تاریخی اور فکشنی روپ میں قارئین کے حلقے کو وسیع کرنے لگی۔ ایسے عالم میں صحافیانہ اور تخلیقی ہر دو طرح کی نثر میں مقامی اور بین الاقوامی واقعات سے دلچسپی مسلسل بڑھتی چلی گئی۔ اسی دور میں اردو نثر نے فکشن اور صحافت کو پہلو بہ پہلو فروغ دیا اور بعض صورتوں میں دونوں ایک دوسرے کا دست و بازو بن گئے۔ ایسی ہی ایک مثال فسانہ آزاد ہے جو اودھ اخبار کے ساتھ سپلیمنٹ کے طور پہ شروع ہوا اور بعد ازاں اس اخبار کی شہرت کا بنیادی سبب بن گیا۔

اس دور میں اردو نثر نے نئے سیاسی حالات اور استعماری قوتوں کے زیرِ نگیں تبدیل شدہ عالمی جغرافیے اور بدلے ہوئے بین الاقوامی تعلقات کو بیان کرنے کی سعی کی۔ اس کوشش میں جہاں نئے خطوں نے اردو نثر میں جگہ بنائی وہیں پرانے دوستوں کے ساتھ نئے شعور کے حامل تعلقات کو بھی جگہ ملی۔ ترکی اب محبوب کے ساتھ ساتھ ملی وجود کا اہم ترین جزو بن کر سامنے آیا۔ اس کی جنگیں اب ہمارا مسئلہ بن گئیں۔ اس اپنایئت کے کم از کم دو پہلو ذہن میں رہنے چاہییں۔ مقامی ذہن پر ترکی اور برعظیم کے صدیوں پر محیط ثقافتی تعلقات کا شعور اور استعماری طاقتوں کے عالمی صورتِ احوال کو اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے کی گئی کوششیں۔ برطانوی سلطنت اور روس کے باہمی معاندانہ تعلقات کی پرچھائیں بھی ترکی کی جنگ سے برعظیم میں دلچسپی کے کچھ نئے عناصر پیدا کرنے کا موجب تھی۔ ترکوں سے ثقافتی محبت میں جب استعماری صورتِ حال شامل ہوئی تو ترکی روس جنگ توضیحی اور تخلیقی نثر کا موضوع بنی۔ محض برطانوی سلطنت کے تعلقات مقامی ذہن کو متوجہ کرنے کے لیے ناکافی تھے، ترکوں سے قدیم تعلقات کی آنچ اردو نثر کو دوآتشہ کرتی ہے۔ ترکی اور روس کی جنگیں پانچ صدیوں پر محیط ہیں، تاہم اردو میں جس جنگ سے زیادہ دلچسپی ملتی ہے وہ 1870 کی دہائی کی جنگیں ہیں۔ اور یہ وہ دور ہے جب برعظیم برطانوی نوآبادی تھا۔ اس جنگ کی خبریں اردو اخبارات کا لازمی حصہ تھیں۔ مختلف اردو اخبارات نے اس جنگ کے لیے چندہ بھی جمع کر کے ترکی بھجوایا جس پہ کم از کم ایک اخبار کو تمغہ مجیدیہ بھی دیا گیا۔ سرشار نے اسی جنگ کو فسانہ آزاد کا حصہ بنایا ہے۔ ایک مقبول عام سیریل میں ترکی کی تاریخ، اس کی جنگوں کا احوال، ہمسایوں سے اس کے تعلقات، اس

کے دربار کی صورتِ احوال، عالمی طاقتوں میں اس کے حلیف و حریف اور ترکوں کی شجاعت سب کو تفصیل سے قسط وار شامل کرنا ظاہر کرتا ہے کہ ترکی، اردو قارئین کے کے ذہن و دل کے کس قدر قریب تھا۔

اردو نثر کی حد تک فسانہ آزاد میں پہلی بار ایک شریف زادی اپنی شادی کی شرط بین الاقوامی محاذ پہ جرات آزمائی کو قرار دیتی ہے۔ حسن آرا کی خواہش ہے کہ آزاد سے وہ تبھی شادی کرے گی اگر وہ ترکی کی طرف سے روس کے خلاف صف آرا ہو۔ یہاں سے فسانہ آزاد میں ایک نیا پلاٹ شروع ہوتا ہے۔ سرشار کے پاس موقع ہے کہ وہ ترکوں کی جنگی مہارتیں اور کرداری اوصاف کھل کر بیان کریں۔ فسانہ آزاد کی کم از کم دو جلدوں، یعنی قریباً نصف حصے میں یہ جنگ ناول کا مرکز بنی رہتی ہے۔ سرشار ترکوں کی خوش روئی اور بسالت کو بنیادی اوصاف کے طور پہ پیش کرتے ہیں۔ اردو ناولوں کے عمومی مزاج کے مطابق وہ ترک قیدی سپاہیوں پہ روسی لیڈیوں کو ہزار جان سے عاشق دکھاتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہو، ترکوں کی خوبروئی انھیں جانِ عالم بنادے تو حیرت کیا۔ سرشار نے ترکی سپاہیوں کی تعریف میں لکھا:

> "ترکوں کی فوج دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جو سپاہی ہے، خوبروئی کی جان، جو افسر ہے بسالت کی کان۔ جوانِ طناز، کشیدہ قامت، خوش انداز، خوبرو، خوش خو، بہارِ طبع، رنگین مزاج، بڑے کس بل کے لوگ ہیں، جیوٹ جیالے، میدانِ کارزار میں پہنچے تو شیرِ ژیان بن گئے، اور ملک کے نام پہ جان دیتے ہیں۔ چاہے دو دن تک کھانا نہ ملے، مگر غنیم کو پشت نہ دکھائیں گے، قتل کریں گے اور مر جائیں گے۔ لو کی شدت، آفتاب کی حدت، سردی کی کثرت، ایک کو نا مانیں گے، چاہے برف گرے، چاہے کہرا پڑے، یا ہوا سے جگر تک ٹھٹھر اجائے، مگر ترکی سپاہی کا قدم پیچھے نہ ہٹے گا۔"(2)

یہاں سرشار کی نثر کا رنگ ڈھنگ اپنے جوبن پہ ہے، وہ ترکوں کی خوبصورتی اور بہادری کے بیان میں پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ ناول میں کئی جگہ دورانِ جنگ اور تیاریوں کے وقت وہ انھی دو اوصاف کی مثالیں تفصیل سے سامنے لاتے ہیں۔ مختلف مقامات پہ جان کی پرواہ کیے بغیر لڑنا، تعداد میں کمی کا خیال نہ کرنا، تھکاوٹ کو خاطر میں نہ لانا وغیرہ۔ ناول کا مرکزی کردار ہندوستانی ہے، تاہم اسے سرشار نے قدبت اور رنگ کے اعتبار سے ترکوں کے قریب رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روسی آزاد کو قید کر لینے کے باوصف کبھی یہ نہیں جان پاتے کہ آزاد کی قومیت کیا ہے۔ یوں سرشار کے نزدیک سراپے کا جمالیاتی معیار ترک ہی ہیں۔

سرشار نے ترکی روس جنگ کی بازیافت میں اپنی تمام تر ہمدردیاں ترکی کے ساتھ رکھی ہیں، لیکن انھوں نے ناول میں تاریخی حقائق کا منھ نہیں چڑایا۔ اس جنگ میں ترکی سپاہیوں کے ساتھ آزاد بھی روس کا قیدی بنتا ہے۔ جنگ میں شکست کے اسباب پہ بحث کو سرشار نے مکالموں کا حصہ بنایا ہے۔ اس حوالے سے ان کے بیانات کا نچوڑ افسران کی نااہلی اور باہمی چپقلش ہے۔ یوں جنگ کے نتائج کی ذمہ داری افسران کی ناتجربہ کاری پہ آن پڑتی ہے۔ سرشار نے دکھایا ہے کہ ترک سپاہیوں کی شجاعت اور جان نثاری نے سلطنت کو بڑی حد تک بچائے رکھا، وہ بغیر تنخواہ بھی جنگ لڑنے پہ آمادہ ہیں، سلطنت کی حفاظت سے زیادہ انھیں کوئی چیز عزیز نہیں ہے۔ جنگ کے خاتمے پہ وہ آزاد کے ذریعے ترکی کو چند مشورے دیتے ہیں، جن پہ اس دور کے عالمی حالات اور استعماریت کی واضح چھاپ ہے۔

اردو افسانوی نثر میں ترکوں سے محبت کرنے والے اہم ترین نمائندوں میں سجاد حیدر یلدرم سب سے نمایاں ہیں۔ یلدرم نے ترکی فکشن کو اردو میں ڈھالا اور اپنے ماخوذ اور طبع زاد افسانوی تحریروں میں ان موضوعات اور سماجی تبدیلیوں اور ترقیوں کو پیش کیا جو انھیں ترکوں میں دکھائی دیتی تھیں۔۔ وہ ترکی کو جدید مسلم سماج کے طور پہ دیکھتے تھے، جو یورپی اثرات سے منقلب ہو رہا تھا۔ ان کی دلچسپی یہ تھی کہ جدید ترکی ہندوستانی قارئین کے لیے ایک مثال فراہم کرے گا جو خود اپنی تہذیبی زندگی کے اسی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ یلدرم نے لکھا کہ ان کے پیشِ نظر انگریزی ناولوں کے اردو تراجم کے بالمقابل "ایک نئی قسم کا اضافہ" ہے۔ وہ "ترکوں کی سوشل لائف کا اصلی نقشہ بھی ہمیں" دکھانا چاہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ انھوں نے یہی بیان کی کہ جو انقلاب ہمیں سوسائٹی اور طرزِ معاشرت میں درپیش ہے وہ ترکوں کو پیش آ چکا ہے۔

یلدرم کے تین ناولانہ تراجم میں ثالث بالخیر بھی شامل ہے۔ ارکان ترکمان نے اس ترجمے کا اصل سے تقابل کر کے نتیجہ نکالا کہ یہ لفظی یا آزاد ترجمہ نہیں بلکہ ماخوذ ہے۔ (3) اصل ترکی ناول میں مصنف کا لہجہ اور تھیم دونوں حزنیہ ہیں، جو یہ دکھاتے ہیں کہ مشرقی سماج میں مغرب کی نقالی کنفیوژن پیدا کرے گی، جبکہ یلدرم مغربی اثرات کو پسند کرتے تھے اسی لیے ترجمے کا رنگ ڈھنگ اس حزنیہ فضا سے عاری ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کی جدت پسندی پر ترکی کے اثرات واضح تھے۔ عورتوں کی تعلیم اور جدت کاری، محبت اور ازدواجِ محبت کو جس انداز سے انھوں نے کھل کر بیان کیا یہ اردو میں نئی طرح تھی۔ ترکی فکشن اور

سماج دونوں کا اس انداز کی تشکیل میں بنیادی کردار تھا۔ انھیں ترکی میں عورت کی سماجی حیثیت میں ہونے والی بہتری نے متوجہ کیا۔ اس تھیم کو خود انھوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ وہ ترکی عورت کو ہندوستانی خواتین کے لیے رول ماڈل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں جو معاشی آزادی رکھتی ہے اور اپنا جیون ساتھی خود منتخب کرتی ہے۔ ان کا ایک افسانہ "سودائے سنگین" خالد ضیا اوشاکلی کے افسانے سے ماخوذ ہے۔(4) تاہم یلدرم نے اسے مقامی رنگ دے دیا ہے۔ بمبئی کو افسانے کا مکان منتخب کر کے وہ پارسی خواتین کی خوش ذوقی اور زندہ ترطرزِ حیات کا محبت سے ذکر کرتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک حسن پرست اور بے کل نوجوان کا قصہ بیان ہوا ہے۔ اس کی اپنی طبیعت سے قطع نظر یلدرم افسانے میں ایک مقام پہ برعظیم کی شہری مسلم خواتین کی بے رنگ زندگی پہ تبصرہ کرتے ہیں۔ رومانوی نوجوان عورت کو موسیقی، شعر اور پھول کا مرقع تصور کرتا ہے۔(5) وہ بمبئی کے چوپاٹی ساحل پہ موجود ہے جہاں ایک پارسی تہوار کی وجہ سے کافی رونق ہے۔ پارسی خواتین کی رنگین ساڑھیوں کے تذکرے کے بعد وہ سمندر اور آسمان کے افق پر ملنے سے بننے والی قوسِ قزح سے زندگی کی رنگینی کو بیان کرتے ہیں:

> "قوسِ قزح کی ملکہ کا یہ حکم ہے کہ جسے رنگ کی لطافت سے لگاؤ نہ ہو، وہ یہاں نہ آئے۔ مسلمان عورتیں یہاں نہ تھیں۔ وہ پھولوں کے درمیان، سمندر کے کنارے، آبشاروں کے قریب، سبزے کے اوپر، موسیقی سے بھری فضا میں کب ہوتی ہیں۔"(6)

لہجے کے تاسف سے واضح ہے کہ یلدرم کو مسلم خواتین کی محدود زندگی میں لطافتوں اور مختلف ذائقوں سے ناآشنائی پریشان کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ترکی سماج میں یورپی اثرات اور عورت کے لیے نسبتاً کشادہ زندگی کو نہ صرف پسند کیا بلکہ اپنی تحریروں اور عملی زندگی میں اسے اپنایا بھی۔

بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں صرف تخلیقی نثر ہی نہیں، ترکوں اور ترکی سے عمومی دلچسپی اخبارات اور پریس مالکان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ترکی کے سفر نامے اور ترکوں کی کتب کو اردو کا روپ دیں۔ ایسی ہی ایک کوشش سید علی امیر البحر کے سفر نامے کو اردو کا روپ دینا ہے۔ یہ کوششیں اس ابھرتے ہوئے ملی شعور کی وجہ سے تھیں جس کے تحت پین اسلام ازم کا فروغ ہو رہا تھا۔ آزادی کی خواہش جڑ پکڑ رہی تھی اور اس کی مختلف ملی صورتیں ہندوستانی مسلمان کے ذہن پہ اثر انداز ہو رہی تھیں۔ امیر البحر کے سفر نامے کو

اخبارِ وطن کے کارپردازوں نے اردو میں منتقل کیا۔ اخبارِ وطن کے ایڈیٹر محمد ان شااللہ نے ترجمے کی کاوش کو پیش کرتے ہوئے وضاحت کی کہ امیر البحر کا زمانہ سیاحت سلطنتِ ترکی کے عروج کا دور تھا۔ اور جن ممالک میں امیر البحر نے سیاحت کی سب اسی سلطنت کی رونق کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔ وہ تاسف سے بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں نے سیر وفی الارض کے ربانی حکم سے اغماض برتا اور رونق جاتی رہی۔(7) ترکی سے دلچسپی کا ایک سبب یہاں قومی ہے۔ قومی ادبار کو دور کرنے کے لیے عروج کے قصے اور مثالیں سامنے لائی جارہی ہیں۔

ترکوں کو عوامی دلچسپی کے پیشِ نظر اردو تھیئٹر ڈراموں میں بھی دکھایا گیا ہے۔ آغا حشر کا ڈرامہ "ترکی حور" اس کی ایک مثال ہے۔(8) اس ڈرامے کے کردار اور منظر نامہ ترکی ہے۔ ڈرامے کو ناظرین کے لیے پرکشش بنانے کے واسطے عنوان میں حور کا لفظ رکھا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی مرکزی کردار رشیدہ حسن میں بے مثال ہے اور عصمت میں باکمال۔ انھی اوصاف کے سبب اسے ترکی حور کہا گیا ہے۔ وہ شرابی شوہر کی خاطر امیر باپ کا گھر چھوڑتی ہے۔ وہ شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہے۔ شوہر کی محبت کو ایمان اور خدمت کو عبادت قرار دیتی ہے۔ انتہائی عسرت کے عالم میں سینے پرونے کا کام کر کے گھر چلانے کی کوش کرتی ہے، اپنی عصمت پہ ہونے والے حملے کا مقابلہ کرتی ہے۔ غربت، لالچ اور خوف کا بہادری اور استقامت سے سامنا کرتی ہے۔ جس شوہر کے لیے یہ سب مصائب برداشت کرتی ہے، اسی کے ہاتھوں قتل کا وار سہتی ہے، لیکن اُسے پولیس سے بچالیتی ہے۔ ترکی حور کے یہ اوصاف ہندوستانی شہری مردانہ اقدار کی پیروی کرتے ہیں اور تھیئٹر میں حاضرین کی فوری دلچسپی اور ذوق کی تسکین کا سامان بھی ہیں۔ کردار ناموں کی حد تک ترکی ہیں، اور عادتاً ہندوستانی۔ اس کے باوصف یہ دیکھنا چاہیے کہ ترکی حور ہندوستانیوں کو متوجہ کر رہی ہے۔ اور آغا حشر اسے ایک مثالیے کے طور پر اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

میرزا ادیب کا تاریخی یک بابی ڈرامہ "مادرِ قوم" ترک خاتون کی ایک بالکل مختلف تصویر سامنے لاتا ہے۔ یہاں اہلِ اردو کے لیے ترک ایک ماں اور ملکہ کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ کوسم سلطان ایک مدبر اور جلیل القدر ملکہ ہے، جس کا فراخ ماتھا ذہانت کی علامت ہے، خشک رخسار زندگی کے تلخ حقائق کی تمازت کا حوصلے اور محنتِ شاقہ سے سامنا کرنے کا اظہار ہیں۔ اس کے مزاج میں ماں کی ممتا اس قدر ہے کہ اسے دنیا کی سب سے زیادہ محبت کرنے والی ماں کہا گیا ہے، لیکن وہ خود کہتی ہے کہ "ماں کی محبت انصاف کی

آنکھوں کو اندھا نہیں کر سکتی۔ "(9) ڈرامے کی ابتدا میں اس کی بیٹے سے محبت کو کنیزوں کے بیانات اور اس کی حالتِ نیند میں بے چینی اور اندیشوں سے معمور خوابوں کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔ جب اس کے علم میں آتا ہے کہ اس کے بیٹے نے وزیرِ اعظم کو قتل کروا دیا ہے تو وہ بے دریغ اپنے لختِ جگر کے لیے سزائے موت تجویز کرتی ہے، جس پہ ہجوم "مادرِ قوم زندہ باد" کے نعرے لگاتا ہے۔ میرزا ادیب دکھاتے ہیں کہ انصاف پسندی کی راہ میں ممتا بھی رکاوٹ نہیں بنی۔ اعلیٰ ترین انسانی قدر کی نمائندگی ترکی خاتون کے ذریعے کی گئی ہے۔

اب ایک مثال اردو کے سب سے معروف افسانہ نگار منٹو کے ہاں سے۔ منٹو کے افسانے "ماتمی جلسہ" میں کمال اتاترک کی موت پہ ہندوستانی شہری مسلمانوں کے مختلف ردِ عمل دکھائے گئے ہیں۔ عجیب بات ہے یہ پیشکش آج نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود بڑی حد تک سماجی اور نفسیاتی رویوں کی نمائندہ بن جاتی ہے۔ کمال اتاترک کی موت کی خبر ریڈیو اور ابلاغ کے دیگر ذرائع سے جب ہندوستان پہنچتی ہے تو یہاں کے مسلمان تڑپ اٹھے ہیں۔ ایک بڑے آدمی کی موت پہ متنوع ردِ عمل سامنے لائے گئے ہیں۔ یہ ردِ عمل ایک طرف ان لوگوں کے عمومی شعور اور تصورات کا اظہار ہیں دوسری طرف اتاترک کی شخصیت کے بین الاقوامی یا کم از کم ہندوستانی مسلمانوں پہ اس کے ارتسامات کا اظہار بھی ہیں۔ پھر یہ کہ عوامی شعور کی تشکیل میں ذرائع ابلاغ کی بنیادی اہمیت بھی غیر محسوس انداز میں سامنے لائی گئی ہے۔

ریڈیو پہ کمال کی موت کی خبر سن کر عام مسلمان پریشان ہے۔ منٹو کا طنزِ ملیح یہاں عروج پہ ہے تاہم کہیں اسلوب پہ جذباتیت کا شائبہ تک نہیں۔ وہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح سٹے باز بھی اس خبر سے جذباتی طور پہ متاثر ہوئے۔ رات گئے چائے پینے والے بھی اتاترک کی موت پہ مضطرب ہیں۔ ان عام ہندوستانیوں کی نظر سے اتاترک کی تصویر دکھا کر منٹو نے اس بڑے لیڈر کی شہرت اور عوامی شعور پہ اس کے اثرات کی نقش گری کی ہے: ایک شخص اتاترک کو نجات دہندہ تصور کرتا ہے۔ وہ اس کی موت پہ غمزدہ ہے کہ اتاترک نے ہندوستان پہ حملہ کر کے مسلمانوں کو آزاد کروانا تھا اور اب وہ منصوبہ ادھورا رہ جائے گا۔ دوسرے کو یہ خبر سن کر خیال گزرتا ہے کہ کم از کم اب نمازِ جمعہ شروع کر دینی چاہیے۔ پہلے کا غم سیاسی ہے، دوسرے کا دینی اور ذاتی۔ منٹو نے فنی مہارت سے دونوں سطحوں کے جذباتی ردِ عمل منتخب کر کے پیش کر دیے ہیں۔ افسانے میں بعد ازاں چند فساد پسندوں کو اس عظیم لیڈر کی موت پہ ہڑتال کی منصوبہ بندی کرتے

ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مکالموں میں شامل بے نام کرداروں کے ذریعے اتاترک کا بحیثیت لیڈر مقابلہ محمد علی جوہر اور جناح سے کیا گیا ہے اور ہر دو سے تقابل میں مسلمانوں کی کوشش اتاترک کا پلڑا بھاری دکھانے کی ہے۔ عوامی شعور کے مطابق اتاترک کی عظمت کا ثبوت دکانوں کی بندش، عمومی ہڑتال، ٹرام کی روک اور ماتمی جلسے کے انعقاد سے ملتا ہے۔ اسی جلسے میں ایک چھوٹا صنعتکار عہد کرتا ہے کہ وہ اپنے صابن کا نام کمال سوپ رکھے گا۔

جلسے میں اتاترک کی شان میں نظمیں پڑھی جاتی ہیں اور تقریریں کی جاتی ہیں۔ ہجوم نعرے لگاتا ہے۔ ان میں اسلام زندہ باد کا نعرہ سب سے بلند ہے، جس سے میدان کانپ جاتا ہے۔ تقریروں اور ان پہ پر جوش عوامی ردِ عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں اتاترک کی پسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے انگریزوں کو شکست دی، "انگریزوں کو لات مار کے باہر نکال دیا"، "کمال نے یونانی بھیڑوں کو اسلامی خنجر سے ذبح کر ڈالا۔" اس نے "غازی صلاح الدین ایوبی کی سپاہیانہ عظمت کی یاد تازہ کی"، یورپ کے مردِ بیمار کو "قوت بخش" اور "مردِ آہن۔" بنا دیا۔ یعنی "بہ نوکِ شمشیر یورپی ممالک سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔" (10) اتاترک کی یہ صفات ہندوستانی مسلمانوں کی آرزوؤں کی ترجمان ہیں، یہی وجہ ہے کہ پنڈال جوش و خروش سے معمور ہو جاتا ہے اور نعرے ہیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک مقرر ان باتوں کے بعد جب اتاترک کی ان انقلابی تبدیلیوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے ترکی کو اور کامیاب جدید ریاست بنایا تو مجمعے کا عمومی شعور یہ باتیں ہضم نہیں کر پاتا۔ مثلاً جب مقرر بتاتا ہے کہ اتاترک نے جہالت کو دور کیا، نئی روشنی پھیلائی، رومی ٹوپی ترک کی اور اذان عربی کی بجائے ترکی میں دینے کا حکم دیا اور اس کی مخالفت کرنے والے علما سے سختی برتی تو سامعین ان باتوں کو "کفر" قرار دیتے ہوئے مقرر پہ پتھر برساتے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ مقرر جھوٹ بولتا ہے۔ جلسے میں بھگدڑ مچ جاتی ہے، اور پنڈال مصطفیٰ کمال اور اسلام زندہ باد کے نعروں سے گونجتا رہ جاتا ہے۔ افسانہ ہمیں یہ باور کرواتا ہے کہ عمومی شعور کسی شخصیت، فکر یا قوم کی وہی تصویر پسند کرتا ہے جو اس کی اپنی امنگوں کی ترجمان ہو۔

اس مختصر جائزے میں ہم نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ترک اور ترکی کے ساتھ ہمارے ثقافتی تعلقات انیسویں اور بیسویں صدی میں مسلسل تبدیل ہوتے قومی اور ملی شعور کا لازمی حصہ ہیں۔ وہ ہمارے جمالیاتی اور اخلاقی معیارات کے اعلیٰ مثالیوں کی صورت میں موجود رہے ہیں اور سیاسی و سماجی اقدار

کی صورت گری کے لیے بہترین نمونے بھی ہمیں ترکوں کے ہاں سے میسر آئے ہیں۔ مقبول سیریل فکشن ہو یا سٹیج ڈرامہ ہو، سفر نامہ ہو، ترجمہ یا افسانہ برعظیم کے مسلمان ترکوں سے تخلیقی سطح پہ ربط ضبط قائم رکھے ہوئے ہیں، جو قیامِ پاکستان کے بعد زیادہ مضبوط ہوا۔ جس کی صورتیں آج مقبول ترکی ڈراموں کی شکل میں سیکھی جاسکتی ہیں۔

حواشی:

1۔ میر امن، باغ و بہار، مرتبہ رشید حسن خان (لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، 2017)

2۔ رتن ناتھ سرشار، فسانہ آزاد، جلد دوم، دوسرا ایڈیشن (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، 2002)، ص562

3۔ ڈاکٹر ارکان ترکمان، یلدرم کے ترکی تراجم: ایک تقابلی مطالعہ [Sajjad Haydar Yildrim's Translations: A Comparative Study] (پٹنہ: خدابخش لائبریری، 1986)، ص18

4۔ اشرف پرویز، "سودائے سنگین از سجاد حیدر یلدرم۔ ترکی متن سے تقابل و تجزیہ" مطبوعہ حرف و سخن 3، شمارہ 2 (2019ء) ص1-4

5۔ سجاد حیدر یلدرم، "سودائے سنگین" مشمولہ خیالستان: مختصر افسانوں کا مجموعہ (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2006)، ص160

6۔ ایضاً، ص168

7۔ محمد انشااللہ، "عرضِ حال" مشمولہ سفر نامہ سید علی امیر البحر ترکی، سید علی امیر البحر، اردو ترجمہ (لاہور: حمیدیہ پریس، 1906)

8۔ اس ڈرامے کے مرتب عشرت رحمانی کے بقول یہ دسمبر 1922 میں لکھا گیا لیکن طباعت کے مراحل 1954 میں طے کر سکا۔

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری، ترکی حور، مرتبہ عشرت رحمانی (لاہور: اردو مرکز، 1954ء)، ص6
عشرت رحمانی نے لکھا ہے کہ یہ دور آغا حشر کی ڈرامہ نگاری میں تبدیلیوں کا تھا جب انھوں نے

اسٹیج کو اصلاحِ معاشرت کا ذریعہ بنایا تھا اور ان کے اسلوب میں سادگی آگئی تھی۔مزید تفصیل کے لیے مندرجہ بالا ڈرامے کا دیباچہ ملاحظہ کیجیے۔

9۔ میرزا ادیب، "مادرِ قوم، "مشمولہ آنسو اور ستارے (لاہور: مکتبہ کاروان، س ن)، ص 104

10۔ سعادت حسن منٹو، "ماتمی جلسہ "مشمولہ پورا منٹو، جلد دوم، مرتبہ شمس الحق عثمانی (کراچی: اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 2013)، ص 83